حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی قدس سرہٗ
اور سربراہان مملکت

☆ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

کاتب الحروف کے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ یہ عنوان حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت کے اہم گوشے کو روشن کرتا ہے اور یہ تذکرہ مولانا کی فکر اور دعوتی سرگرمیوں کا رخ سمجھنے میں بہت معاون ہوگا اور مولانا کو جو انفرادیت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی، اس کا تشخص واضح کرے گا۔

مولانا کو سربراہان ممالک سے ملنے کے متعدد مواقع ملے، ایک دو سربراہان حکومت سے ملے بھی، مگر ملی ضرورت کی خاطر، ایک کار خیر سمجھ کر، کوئی دل کی خواہش یا اس کی طلب ان کے اندر نہیں تھی۔ سوائے سعودی عرب کے بادشاہوں، حکمرانوں، اور وہاں کے علمی و دینی رہنماؤں سے ملنے کی مسرت بھی حاصل ہوئی اور مولانا اس کے خواہشمند بھی رہے، کیونکہ یہ حضرات دین کے پاسدار، توحید کے داعی اور سنت کی حمایت کرنے والے ہیں۔ ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر آواز دی جاسکتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حوالہ دیا جاسکتا ہے اور آخرت میں اللہ کے آگے جواب دہی پر ایمان کامل نہ سہی، اس کے منکر یا منحرف بھی نہیں رہے۔ سعودی عرب کے ملوک و حکام کو مولانا سے ذہنی وابستگی رہی، کیونکہ انہوں نے بھی دیکھ لیا کہ ان کے اندر پٹرول سے پیدا ہونے والی دولت کا رائی برابر بھی طمع نہیں تھا اور نہ کبھی اشارۃً اپنے لیے یا اپنے ادارے (ندوۃ) کے لیے کوئی سلسلہ جنبانی کی۔

مولانا کی جس مسلم سربراہ سے پہلے ملاقات ہوئی وہ ملک عبداللہ بن حسین والی اردن تھے، یعنی موجودہ بادشاہ عبداللہ بن شاہ حسین کے پڑدادا۔ ان کا نسب مختصراً یہ ہے کہ موجودہ بادشاہ عبداللہ

☆ مکہ مکرمہ، سعودی عرب

بن حسین بن طلال بن عبداللہ بن حسین بن علی شریف مکہ۔ مولانا مصر وسوڈان کے طویل دورے کے بعد اگست ۱۹۵۱ء میں دمشق تشریف لائے اور دمشق کے دوران قیام میں اردن تشریف لے گئے۔ وہاں کے مفتی اعظم شیخ عبداللہ القلقیلی نے اپنی خاص لائبریری میں چند مسودات دکھانے کی دعوت دی تھی۔ مولانا کے ہمراہ تبلیغی جماعت کے سرگرم مخلص رکن مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ اس زمانے میں افغانستان کے سفیر شیخ محمد صادق مجددی علیہ الرحمہ بھی وہاں موجود تھے (بعد میں وہ مدینہ منورہ آکر قیام پذیر ہوگئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا)۔ انہوں نے شاہ سے مولانا کی آمد کا ذکر کیا۔ شاہ نے دعوت دی اور ایک روز عین اس وقت جبکہ مولانا اپنے میزبان کے ساتھ کھانے پر بیٹھنے والے تھے کہ دیوان شاہی کے سیکرٹری جلالۃ الملک کا دعوت نامہ لیکر آئے اور بادشاہ کی خواہش کا ذکر کیا کہ وہ اس وقت کھانے پر آپ کو مدعو کرتے ہیں۔ مولانا اور مولانا بلیاوی وہاں تشریف لے گئے۔ شاہ نے مولانا کو دیکھتے ہی کہا کہ آپ کے خدوخال سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان مہاجرین میں سے ہیں جو یمن جاکر آباد ہوگئے تھے اور وہی شاخ ہندوستان میں آباد ہوئی۔ ایک جمعہ کو شاہ نے مسجد میں تلاش کرایا اور کھانے کی دعوت دی، اس روز کھل کر باتیں ہوئیں۔ شاہ نے ''**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**'' پر اپنی رائے اور دعائیں دیں، مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی کی روایت ہے کہ مولانا نے شاہ اردن سے کہا:

''جلالۃ الملک! اگر دنیا کا چھوٹا سے چھوٹا ملک جس کے وسائل محدود ہوں جس کی آمدنی کم ہو، جس کی فوج بھی نا قابل ذکر ہو، اگر ایسا ملک بھی اللہ کا نام لیکر دین کی دعوت کو اپنا شعار بنالے اور اسلامی احکام اپنے ملک میں نافذ کرلے تو وہ تاریخ میں اس کے وسیع دروازوں سے داخل ہوسکتا ہے''۔

بادشاہ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، مگر بقول مولانا بلیاوی کے، وہ اپنے گوشہ چشم سے اپنے ایک وزیر کو دیکھ رہا تھا، گویا کہہ رہا ہو دیکھو ایک ہندی نوجوان کیا کہہ رہا ہے۔ مولانا اس ملاقات کے بعد دمشق تشریف لائے اور وہاں یہ خبر ملی کہ شاہ اردن کو ایک فلسطینی نے گولی مار کر شہید کردیا ہے۔ ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے جس کا مولانا نے خود بھی تذکرہ کیا ہے کہ شاہ کی طرف سے ایک معقول رقم بطور ہدیہ پیش کی گئی۔ مولانا جھجکے اور معذرت کے ساتھ اس ہدیہ کو لوٹا دینے کی تمہید

کررہے تھے کہ شیخ محمد صادق مجددی نے مولانا کے کان میں کہا یہ ہدیہ آپ قبول کرلیں، کیونکہ بادشاہ کی یہ توہین سمجھی جاتی ہے کہ ان کا ہدیہ کسی نے رد کردیا ہو۔ مولانا وہاں سے اٹھ کر آئے اور دماغ پر اس رقم کا وزن تھا۔ وہاں فلسطین فنڈ میں چندہ جمع کرنے کا ایک ادارہ تھا، جس کے صدر خود بادشاہ تھے، مولانا نے پوری رقم اسی فنڈ میں داخل کردی۔

وہ زمانہ جب مولانا قاہرہ تشریف لے گئے ہیں۔ وہ شاہ فاروق کی بادشاہت کا زمانہ تھا۔ مصر کے مفتی اعظم شیخ حسنین مخلوف مولانا سے بے انتہا محبت کرنے لگے تھے۔ انہوں نے کہا کہ شاہ سے ملنے کا وقت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے بہت معذرت کی کہ ایسا نہ کریں۔ لوگوں سے کہا کہ اخبارات میں ان کی تصویر دیکھ چکے ہیں، مل کر کیا کریں گے؟ مگر جب حجاز تشریف لائے تو ایک نئی امنگ، نیا جوش و ولولہ مولانا کے اندر پیدا ہوا۔ مولانا کے چند تبلیغی رسائل جن علماء نے دیکھے تھے، وہ مولانا کے گرویدہ ہوگئے تھے، خاص طور پر علامہ شیخ عمر بن حسن رئیس ھیئات الامر بالمعروف والنہی عن المنکر'' امام حرم مکہ شیخ عبدالمھیمن مصری مدیر تعلیم عالی (اس وقت وزارت نہیں تھی)، شیخ عبداللہ المانع، نوجوان ادباء وشعراء میں الاستاذ، عبداللہ بغدادی، الاستاذ محسن بادوم، شیخ عبدالقدوس انصاری، شیخ محمود حافظ اور سب سے زیادہ شیخ احمد عبدالغفور عطا، جنہوں نے مولانا کے تعارف میں ایک مقالہ سعودی ریڈیو سے نشر کیا تھا، ادھر مولانا بلیاوی کی خواہش بلکہ تڑپ کہ ان سب کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی شخصیات سے آگاہ کیا جائے اور ان کو تبلیغی مہم پر گھر سے نکلنے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ یہ سب کام ہوئے اور خالص سعودی عرب کے پروردہ علماء ادباء اور شعراء کے ایک گروہ نے تبلیغ کے لیے وادی فاطمہ میں ایک رات بسر کی۔ حکومت کے بڑے لوگوں میں شیخ عمر بن حسن نے کافی مدارات کی اور مولانا کو راضی کیا کہ بادشاہ تو اب تقریباً معذور ہوچکے ہیں۔ ان کے ولی عہد امیر سعود (جو بعد میں جلالۃ الملک سعود بن عبدالعزیز ہوئے) کو ایک خط لکھیے۔ مولانا نے جو ان کو مکتوب لکھا اس کے بارے میں شیخ عمر آل حسن کا بیان ہے کہ ولی عہد نے اس کو بار بار پڑھا اور متاثر ہوئے۔ یہ خط مولانا کے ان خطوط کے مجموعہ میں چھپ چکا ہے۔ اور'' **کیف ینظر الی الحجاز وجزیر العرب** '' (یعنی مسلمانان عالم حجاز اور جزیرہ عرب کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں) میں موجود ہے۔

پھر ملک فیصل شہید کا زمانہ آیا، جبکہ سعودی عرب ایک صحرائی ملک کی حیثیت سے نکل کر متمدن دنیا میں عزت کے مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور لوگ ان کو بغیر دعویٰ کے خلیفہ المسلمین یا امیر المؤمنین کہنے لگے۔ ان کے بارے میں خود مولانا کی شہادت یہ رہی کہ وہ ایک انتہائی گہرا، ہوشمند، ذی عقل اور واقف کار بادشاہ ہے، مولانا کی ان سے چھ مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں اور وہ اس طرح کہ خود بادشاہ کی طرف سے تمہید ہوئی۔ تنہائی میں ملاقاتوں کی تصویریں اخبارات میں بار بار چھپ چکی ہیں۔ مولانا نے ان سے کیا کہا اور انہوں نے کیا جواب دیا، یہ سب مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں موضوع گفتگو کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک عرب تاجدار، دولت مند، جہاں دیدہ مسلمان، موحد، داعی، گردوپیش سے واقف شخص سے ایک عالم ہندی کو کیا کہنا تھا؟ ایک سادہ کُرتے اور شیروانی میں ملبوس عالم، جس کی نہ کوئی حکومت اور نہ کسی حکومت کا نمائندہ، نہ سیاسی اور نہ سیاست سے دلچسپی رکھنے والا، محض ایک مدرسہ کا آدمی، کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہا؟ یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس داعی دین عالم کو بادشاہوں سے زیادہ دل کا غنی بنایا تھا۔ کسی کو اس کے اخلاق اور دینی حمیت کے پیمانے سے ناپنے والا شخص جس نے بادشاہ سے تنہائی میں بھی ملکر ایک ضروری بات عرض کرنا ہے، کہہ کر اپنے اوپر مالی دباؤ کا ذکر کرتا۔ وہ درسگاہ جس کا وہ ناظم اور ذمہ دار رہے، اس کے لیے امداد کا طالب ہوتا۔ کسی عمارت کی تعمیر کا خرچ طلب کرتا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی نہیں تو اپنے ملک میں مسلمانوں کے ساتھ نا انصافی کا رونا روتا۔ خون مسلم کی ارزانی کا ذکر کرتا۔ اس کے لیے فنڈز میں کسی ''برکت'' کا طالب ہوتا۔ یہ بھی نہیں تو عرب فرماں روا کے ذریعہ اپنے ملک کے فرماں روا سے عدل وانصاف کی فریاد کرتا، مگر ان کو معلوم تھا کہ اپنے گھر کی دیوار اگر گر رہی ہے تو خود ہی اس کی مرمت کر کے اپنے قوت بازو سے اس پر پشت پناہ تعمیر کر سکتا ہے۔ دوسرے کچھ نہیں کر سکتے اور اگر کریں تو کوئی کارآمد بات نہ ہوگی۔

اگر عقیدۂ وعمل کی تصحیح مطلوب ہے تو اچھی بات ہے، مگر یہ معلوم رہے کہ جس سے فریاد کرنے جا رہے ہیں۔ وہ خود عقیدۂ وعمل سے واقف ہی نہیں اس پر عامل ہے۔ وہ بادشاہ ہے، اس کو بولنا بھی آتا ہے اور اس کے اردگرد بے شمار عالم وفقیہ ہیں جو اس کی بات کو سچی بات ثابت کریں۔

ان سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کیا کہا؟ یا کیا کہنا چاہیے؟ بہرحال ذیل کی ''تحریری'' گفتگو ملاحظہ فرمائیں۔

سعودی عرب اس وقت تازہ بتازہ دولت مندی کے دور میں داخل ہوا تھا۔ حکومت عوام کو راضی رکھنے یا ان کا حق سمجھ کر حکومت دل کھول کر خرچ کر رہی تھی۔ نوجوان یورپین ممالک میں جا کر تعلیم حاصل کرتے اور تعلیم کے ساتھ آداب مجلس رقص و سرود سیکھتے اور وہ سب ہوتا جس کو شیخ سعدی نے کہا ہے ''درعہد جوانی چنانکہ افتد دانی'' دوسری طرف دولت کی ریل پیل نے، جو افلاس کے بعد آئی، اقتصادی معیار بدل دیئے جو دوسروں کے لیے ''کمالیات'' کی چیزیں تھیں، ان کے لیے ''ضروریات'' بن گئیں۔ نئے عقائد خاص طور پر کمیونزم کے لیے دروازے کھلنے گئے، کعبہ مقدسہ اور روضہ انور زمین کے اندر تھے۔ ان کی گہرائی اور بڑھنے لگی۔ باہر امریکہ بہادر کا راج تھا۔ فکر سازی، عقلیت آفرینی یہ سب یورپین ممالک کی تعلیم کے مطابق بڑھنے اور پھیلنے لگی۔ خطرہ تھا کہ مخلوط تعلیم بھی شروع ہو جائے گی۔ اخلاقی و جسمانی امراض بھی نئے تمدن کے ساتھ آئیں گے جس کے لیے چابک دست نصاریٰ اپنا کھیل کھیل رہے تھے اور یہودی اپنے ڈرامے تیار کر رہے تھے۔ اس صورت حال کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے یہ خط پڑھیے جس کا ترجمہ میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں.

ربیع الاول ۱۳۸۹ھ/ جون ۱۹۶۹ء

یہ مکتوب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنے دست مبارک سے لکھ کر جلالۃ الملک فیصل بن عبدالعزیزؒ کو جدہ میں پیش کیا۔ اس کا جواب مولانا کو ہندوستان میں سعودی عرب کے سفیر نے لکھنؤ لا کر پیش کیا:

صاحب الجلالۃ الملک فیصل المعظم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: وبعد

میں شاہ معظم کا شکر گزار ہوں کہ جب بھی میں نے ملاقات کی درخواست کی، قبول فرمائی گئی۔ اس مرتبہ مجھے یہ خیال ہوا کہ اپنی وہ باتیں قلم بند کر کے آپ کی خدمت میں پیش کروں، کیونکہ گفتگو میں بسا اوقات اہم باتیں رہ جاتی ہیں اور تا کہ یہ تذکرہ جلالت مآب کے پاس محفوظ رہے اور

جناب والا کی توجہات کے حصول کا ذریعہ ثابت ہو۔

جلالۃ الملک:

میرا مطالعہ ہے کہ آج کل ایک بڑا فتنہ جزیرہ عرب کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ جزیرۂ عرب دراصل اسلام کے مرکزی قلعوں میں اہم قلعہ ہے اور امن وسلامتی کا گہوارہ ہے اور یہ فتنے منہ پھاڑے اپنے دانت نکالے تمام اقدار ایمانی کو چبا ڈالنے کے لیے تیار کھڑے ہیں اور ان کے اندر ہمدردی اور رحم کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے، ہر عرب ملک، بلکہ ہر مسلمان شہر سوائے ایک دو نادر قسم کی سرزمین کے اشتراکیت وشیوعیت کا تجربہ کر رہا ہے۔ عوام فوجی حکمرانوں اور حکومت کے باغی حکام کی خود رائی میں پس رہے ہیں۔ یہ باغی عناصر ایسے ہیں جیسے چھوٹے چھوٹے چیچہانے والے پرندے خون پینے والے شکرے کی طرح ان کو نگلنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ اس شیوعیت کے ناپاک قدم اب جزیرۂ عرب کی طرف بڑھ رہے ہیں (۱) اس ملک کی طرف کمیونزم چاروں طرف سے بڑھ رہا ہے۔ شمال وجنوب مشرق ومغرب ہر طرف سے اس ملک کو اپنے قبضہ میں لینے کی تیاری ہو رہی ہے۔ یہ طاقتیں چھپ کر اور کبھی اعلانیہ کبھی بھیس بدل کر، بلکہ کبھی عریاں ہو کر ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما (وسائل اعلام) کے ذریعہ بہت باریک بینی کے ساتھ اور گہری پلاننگ کے ساتھ رات دن اپنا کام کر رہی ہیں۔

زمانہ قدیم سے موجودہ عصر تک مسلم حکومتوں نے عوام کو راضی رکھنے اور حکومتوں کا وفادار بنانے کے لیے جو تدبیریں اختیار کی ہیں ان میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ کارگر، آسان اور تیز تر طریقہ یہ سمجھا گیا کہ عوام عیش کوشی کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ ہر زمانہ کے لحاظ سے تفریحات کے ذرائع حلال وحرام کی تمیز اٹھا کر عوام کی مرضی کو نافذ کرنا حکومت اپنا فرض سمجھے۔ عہد بنی امیہ سے لیکر عہد عباسی اور اس وقت سے لیکر آج تک حکومتیں اپنی کامیابی اسی میں سمجھ رہی ہیں کہ عوام کو ان کی خواہشات پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالے۔ صرف یہ کہ ان کی دلچسپیوں کے مراکز کو منظم کر دیا جائے۔ اس پر ٹیکس لگا دیئے جائیں، مثلاً جوا خانے، جسم فروشی کے اڈوں کو ایک نظام کے ماتحت چلنے دیا جائے اور حکومت ان سے ٹیکس لینے کو اپنی کامیابی سمجھے، لیکن تجربات بتاتے ہیں کہ یہ قومیں جن کو حکومتوں نے اس طرح کی آزادیاں دیں اور ان کے ایسے مواقع فراہم کئے وہی سب سے پہلے

دشمنوں کی صف میں نمایاں کردار ادا کرنے لگیں۔ یہ خواہشات پوری کرنے کو اپنی کامیابی سمجھنے والے افراد اور قومیں کبھی کسی کی وفادار ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ حکومتوں کے ایسے عناصر کو دین و اخلاق، شرف و انسانیت کے نام پر بلانا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ بنو امیہ کے آخر اور عباسی دور کے اوائل سے لیکر پانچ سو برس کے عرصہ میں اسباب تعیش نے حکومتوں کے پائے مضبوط نہیں کیے۔

تاریخ اسلام کے تجربے بہت سچے اور واقعی تجربات ہیں، انہوں نے افراد و اقوام کو کبھی دھوکہ نہیں دیا ہے اور حقائق و واقعات بتائے ہیں۔ پختہ ایمان، عقیدہ کی گہرائی، اخلاقی استقامت۔ معاشی طلب میں میانہ روی اور دین کی خاطر زندگی کا سادہ اور محنت طلب معیار، جس کا خلاصہ تقویٰ اور یوم آخرت کا خوف ہے، حیاء و وفا جس کا زیور ہے، وسیع معنوں میں امانت داری وہ خصائل ہیں جو ناشکری اور انکار کی لعنتوں سے فرد و ملت کو نجات دے سکتی ہیں اور اس کے ذریعہ غدر، خیانت، احسان فراموشی اور قوت کی پرستش کا جذبہ ختم ہوسکتا ہے۔

اس وقت کہ ضیاع ملت کا خوف اور موجودہ حالت پر افسوس و خلق کا بوجھ میرے سر پر ہے۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ عقلی مصائب کے صحیح علاج کا وقت اور اس مملکت کو شرور سے محفوظ رکھنے کا وقت بہت مختصر ہے۔ اس ملک اور ملک کے اندر شعائر اسلام کے مراکز اور وہ مقدسات جنہوں نے اس سرزمین کو اسلام کا قلعہ بنایا ہے اس قلعہ کو شر کی آندھیوں سے بچانے کا وقت بہت مختصر رہ گیا ہے۔ اس وقت اسلام کا باغی عنصر بھیس بدل بدل کر ہماری صفوں میں گھس آیا ہے اور خطا معاف اگر یہ کہوں کہ آخری موقع رہ گیا ہے کہ اسلام کے اس قلعہ کو فساد ارضی سے محفوظ رکھا جائے تو یہ بات خلاف مشاہدہ نہ ہوگی۔ جلالۃ الملک یقیناً بہتر طور پر اور وسیع مفہوم میں اس حقیقت کو سمجھتے ہیں کہ اصلاح حال اور فتنہ و فساد کو روکنے کا وقت ختم نہیں ہوا ہے، مگر بہت کم رہ گیا ہے۔ دوسرے مسلم ممالک، نیز دوسرے امن پسند ممالک کے تجربات آپ کے سامنے ہیں کہ فتنہ و فساد کا یہ سیلاب صرف حکومت اور حکمرانوں کو برباد کرنے کا سبب نہیں بنتے بلکہ اخلاقیات و سماجیات کے معیار کو بھی برہم کر گئے۔ یہاں کوئی سست رفتار پالیسی کام نہیں دے سکتی، بلکہ اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے سخت اور فیصلہ کن قدم اٹھانا ضروری ہے۔ اگر جلالۃ الملک اجازت دیں تو یہ عرض کروں کہ ہماری حالت اس وقت حضرت یونسؑ کی امت جیسی ہے جو تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔ آخری وقت میں

اس کو ہوش آیا اور کفر و فساد سے باز آ گئی تو اللہ نے اس کو عذاب سے بچا لیا۔ میں آخر میں بہت اختصار کے ساتھ مرکزی نقاط Main points آپ کے سامنے رکھتا ہوں:

۱۔ صدق و اخلاص اور پختہ عزم کے ساتھ اس ملک میں جو دینی قوانین جاری ہیں اس کے خلاف جو قدم اٹھایا جائے، اس کو ملک سے بغاوت قرار دیا جائے، خاص طور پر وسائل ابلاغ، نشر و اشاعت، ریڈیو، رسائل و مجلات کے ذریعہ اور تعلیمی اداروں کے ذریعہ سے جو نئی نسل کی ذہنی پرورش گاہ ہے ان میں اسلام کی برتری کو دل و دماغ میں پیوست کرنے کی تدبیر اختیار کی جائے گی۔ اس سرزمین پر کعبہ مقدمہ کا وجود اس امت کی ضمانت ہونا چاہیے کہ یہاں دوسرا دین سر نہیں اٹھا سکتا جس میں عدل وانصاف اور انسان دوستی کا کوئی حصہ نہیں ہے اور جس سرزمین میں مخالف اسلام سرگرمی نا قابلِ برداشت الحاد ہے۔

ومن یرد فیه بالحاد بظلم نذقه من عذاب الیم (الحج: ۲۵)

''یہ (روکنے والے) لوگ معذب ہوں گے اور جو شخص اس میں (یعنی حرم میں) کوئی خلاف دین کا کام قصد ظلم (یعنی شرک و کفر) کے ساتھ کرے گا تو ہم عذاب درد ناک (کا مزہ) چکھائیں گے''۔

۲۔ جلالۃ الملک! جن دینی و اخلاقی اصول و آداب کا اعلان کرتے ہیں اور جس کی قیادت کے وہ واقعی حقدار ہیں اور وہ دین و شریعت کے گہرے نقوش جن کو وہ باقی رکھنا چاہتے ہیں، اخلاقی معیار، دینی مزاج اور شریعت کی پاسداری کا جس طرح آپ اعلان کرتے ہیں ان سب کو اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے پر ان اقدامات کو دیکھا جائے جس کی تشہیر ٹیلی ویژن سے ہوتی ہے اور صحافت و نشریات میں ان اصولوں کو جس طرح پامال کیا جاتا ہے، دونوں کے اندر ایک کھلا ہوا تضاد نظر آتا ہے، اس لیے اس تناقض کو پہلے دور کرنے کی کوشش درکار ہے، اگر یہ نہیں ہے تو آپ کے بیانات کی معنویت کم یا ختم ہو جائے گی اور یہاں کے عام باشندوں میں دینی اقدار کی کوئی قیمت نہیں رہ جائے گی اور جب یہی قومی مزاج بن جائے گا کہ دین محض وعظ کا طالب ہے اور اخلاق و سیرت کی تعمیر کے لیے چند آیات الٰہیہ کی تکرار کی جائے اور عملاً وہ سب ہو جو نا خدا ترس ماحول میں گمراہ حکومتیں کر رہی ہیں، تو پھر قوم سے وہ

صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے جو آڑے وقت میں کام آتی ہے، یا جو ناگہانی افتاد اور مصائب خارجی کا مقابلہ کر سکے۔ زبان سے اخلاقیات کی تعلیم اور شریعت کی اہمیت کا ذکر کرنا اور عملاً تجار و سرمایہ دار طبقہ کے لیے مواقع فراہم کرنا کہ وہ تفریح و وقت گذاری کے مشاغل تلاش کریں اور یہ صورت حال الامر بالمعروف والنہی عن المنکر کی مساعی کو زائل کر دیتی ہے۔ عرب کے مشہور فلسفی اور مؤرخ علامہ ابن خلدون نے قول وعمل کے تضاد کو اقوام وملل کے لیے زہر بتایا ہے جس کی کوئی دوا یا منتر نہیں ہے۔

۳۔ زندگی کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی کاوش، وہ زندگی جس کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے اور اپنی برکتیں عطا فرمائی ہیں اور جس کی بقاء کے لیے اس قوم کی مدد فرماتا ہے جو اس کی حامل ہو اور منکرات (ناپسندیدہ ومعیوب اور غیر مطلوب وغیر معروف) کی تمام قسموں کو زائل کرنا جو اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور بے تعلق ہو جانے کے اسباب پیدا کرتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصولی وعملی زندگی اور اجتماعی و معاشرتی زندگی میں ناکامیاں اور محرومیاں نظر آتی ہیں اور لازمی عنصر بن جاتی ہیں، ان معاملات کو بہت دیدہ ریزی کے ساتھ جانچتے رہنا اور بے جا دولت سمیٹنے اور دوسروں کو کسب حلال سے محروم رکھنا ایک عام سازش ہے جو کمیونزم کو دعوت دیتی ہے اور بہت آسانی سے عوام کے اندر مقبولیت حاصل کر لیتی ہے۔

۴۔ خود غرضی اور خودنمائی کرنے والے عرب لیڈروں سے محفوظ رہا جائے جو اپنی مصالح کے علاوہ کچھ نہیں جانتے، یہ وہی افراد ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے۔

لایرقبون فی مؤمن الّاو لاذمّہ (التوبہ:۱۰)

''یہ لوگ کسی مسلمان کے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول وقرار کا''

یرضونکم بأفواھھم و تابیٰ قلوبھم و اکثرھم فاسقون (التوبہ:۸)

''یہ لوگ تم کو اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور ان کے دل (ان باتوں کو) نہیں مانتے اور ان میں زیادہ آدمی شریر ہیں''۔

یہ وہ ''قائدین'' ہیں جو اپنے دوست ممالک میں انقلاب لانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور بغاوتوں پر عوام کو ابھارنا اور شورید سر سیاسی ذہن رکھنے والوں کو آگے بڑھانا ان کا شیوہ ہے

ان کوسب سے زیادہ بری بات یہ لگتی ہے کہ یہ لوگ کسی ہمسایہ ملک میں فتنہ وفساد برپا کریں۔ بغاوت کرائیں اور اپنے آپ کو ایک ہیرو کی طرح پیش کریں۔

ان کے برعکس سچے مخلص، جہاں دیدہ اور صاحب علم و دانش ہم وطنوں پر اعتبار حکومت کا پایہ عوام میں مضبوط کرتا ہے، بشرطیکہ وہ لوگ اللہ کے لیے اٹھنے والے اور اللہ کے لیے بیٹھنے والے ہو اور مال و دولت کو اللہ کی امانت سمجھتے ہوں، یہ لوگ حکومت کی وقت پر ڈھال ہوں گے اور جنگ کے وقت اپنے ملک، ملک کی مقدسات، ملک کی رکھوالی کرنے والوں کے لیے سپر اور ڈھال بن جائیں گے۔ ایسے لوگ جن کی سیرتیں شبہات سے بالا ہوں جن کی معاشرت کا معیار بتا رہا ہو کہ وہ عالیشان محلات تعمیر کرنے اور دنیا کی سیر وتفریح کرنے اور دادعیش دینے کے لیے دنیا میں پیدا کیے گئے ہیں اللہ سے دعا ہے کہ جلالۃ الملک کو جوارض حرمین کے خادم و پاسبان ہیں، ایسے افراد عطا فرمائے۔ یہ چند سطریں اخلاص ومحبت کے جذبات نے املاء کرائی ہیں اور مجھے جلالۃ الملک کی بالغ نظری، اعلیٰ ذہانت اور اخلاق سے امید ہے کہ یہ سرزمین حرم آپ کی مساعی سے ہمیشہ قابل عظمت رہے گا۔

والسلام

مخلص

(ابوالحسن علی ندوی)

جواب خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مملکت سعودی عربیہ.....نمبر ۳۰۴.....تاریخ ۱۳۸۵/۲/۹ھ

فضیلت مآب عالم جلیل ابوالحسن علی الحسنی الندوی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کو اپنے حفظ وامان میں بخیر وعافیت رکھے، اس کے بعد عرض ہے۔

آپ کا مکتوب گرامی مؤرخہ ۱۵۔۱۲۔۱۳۸۴ھ اور ان کا تمام امور سے واقفیت ہوئی جن کا

ذکر آپ نے اپنے مکتوب میں کیا ہے۔

ہم آپ کے پاکیزہ جذبات واحساسات کی پوری قدردانی دلی شکریہ کے ساتھ کرتے ہیں آپ کی دینی غیرت واسلامی حمیت کی پوری قدردانی کرتے ہوئے آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم نے کبھی گوارہ کیا ہے اور نہ ہرگز کبھی گوارا کرینگے کہ ہمارے سچے اور سیدھے مذہب کے خلاف کوئی شخص مخالف اقدام کرے۔ ہم مولیٰ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ہر اس کام کی توفیق عطا فرمائے جو دین کے لیے مفید اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے نفع بخش ہے اور جس میں ہمارے لیے دین ودنیاوی سعادت کا سامان پوشیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے اور دعوت کی قوت کو ترقی دے

فیصل

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کو بادشاہوں سے ملنے اور ان کی مجلس باریابی کا کوئی شوق نہیں تھا بلکہ اس سے بچتے رہنا پسند فرماتے تھے۔ ہندوستان میں بارہا گورنر ہاؤس سے موقع بہ موقع دعوتیں آتی رہیں، مگر آپ اپنا دامن بچاتے رہے۔ ایک جلسہ میں وزیر اعلیٰ یوپی کو برسر عام بتانا تھا کہ ملک کا کیا حال ہے۔ ہم باہر بلائے جاتے ہیں چار چار ملکوں کی دعوتیں اور ٹکٹیں آتی ہوئی ہوتی ہیں، لیکن جب وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ ملک ہند کا کیا حال ہے اور وہاں مسلمانوں کے ساتھ کیا رویہ حکومت اختیار کیے ہوئے ہے۔ تو ہم جھوٹ نہیں بول سکتے اور سچی بات کہیں گے تو یہ ملک دنیا بھر میں بدنام ہوگا۔ یہ وزیر اعلیٰ وی، پی سنگھ تھے، جو بعد میں وزیر اعظم ہوگئے تھے۔ مولانا کی قیام گاہ کی جب خانہ تلاشی ہوئی تو اس کی مذمت تمام لیڈروں کی تھی۔ وی پی سنگھ نے لکھا تھا ندوہ جیسے Prestigious ادارہ کی توہین ملک کے دستور کی توہین ہے۔

ملک فیصل علیہ الرحمہ کے مولانا بہت قائل تھے۔ ان کی عالمانہ بصیرت، تاریخ دانی، گرد وپیش کے سیاسی واجتماعی حالات سے آگاہی قابل تحسین تھی اور اس شاہانہ وسخت قلبی نے مولانا کی ہمت بڑھائی اور بار بار ان سے ملتے رہے اور اس کے بعد ایک بار اور آخری بار پاکستان کے حکمران

اعلیٰ (صدر جمہوریہ یا ملٹری کمانڈر) مرحوم ضیاء الحق شہید سے ملاقات ہوئی، مولانا نے بلا تأمل کہا کہ اندر سے جس قدر یہ شخص صاف دل اور سچا مسلمان ہے مجھے کوئی اور دوسرا فرماں روا اس درجہ کا نہیں ملا، بلکہ میں اور بھی ملوک وصدر سے مل چکا ہوں، بشمول مرحوم ملک فیصل شہید علیہ الرحمہ کے۔ یہ اطلاع تمام اخبارات میں چھپی تھی بعض حضرات نے دین و مذہب کی یہ خدمت کی کہ اس کی کٹنگ مع ترجمہ رابطہ عالم اسلامی کے دفتر میں روانہ کی، ایک صاحب نے دیوان شاہی میں بھیجی، مگر سعودی حکومت یا وہاں کے اداروں میں سے کسی نے نوٹس نہیں لیا۔

حضرت مولاناؒ جب پہلی بار مملکت سعودی عرب گئے ہیں ''ماذا خسر العالم'' ان کے دوسرے سفر کے دوران چھپ کر آ گئی تھی۔ جس کو وہاں کے تعلیم یافتہ حلقے نے دلچسپی اور اہمیت کے ساتھ پڑھا، مگر حکومت نے کسی سے تعرض نہیں کیا۔ اس موقع پر فضیلت مآب شیخ عمر بن حسن آل شیخ نے مولانا کو ولی عہد شاہ سعود بن عبدالعزیز سے ملنے کی دعوت دی، مولانا نے فرمایا بادشاہ وہ بھی ارض حرمین کا بادشاہ اس سے ملنا فخر وعزت کی بات ہے، مگر ان سے کیا بات کروں گا۔ جو بات میرے دل و دماغ میں گردش کر رہی ہے۔ وہ ولی عہد صاحب کو بتا دیں تو ایک کار خیر ہوگا۔ چنانچہ ایک تحریر تیار کی جو بعد میں ''بین الجبایہ والھدایہ'' کے نام سے شائع ہوئی اور بار بار شائع ہو چکی ہے۔

اس خط کا عنوان یہ تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں ان کے گورنر مصر نے شکایت کی کہ حکومت کا خزانہ خالی ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ جو لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں ان سے کوئی ٹیکس اور جزیہ وغیرہ وصول نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تاریخی جملہ تاریخ کی امانت ہے آپ نے فرمایا تھا:

''ویحک مابعث محمد جابیاً انما أرسل ھادیا''

(تیرا ناس ہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا، بلکہ اللہ نے آپ کو ہادی بنا کر بھیجا تھا)۔

یہ خط دراصل مولانا اور سعودی عرب کے حکمرانوں کے درمیان مکتوب کے ذریعہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے اہم نقاط نقل کرتا ہوں اور اس سے اس یادداشت کو ختم کرتا ہوں۔

خلاصہ مکتوب

بنام سعود بن عبدالعزیز

حکومتوں کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں دو قسم کی حکومتیں تھیں، ایک حکومت تو وہ ہے جس کا مقصد ملک کے خزانے کو بھرنا اور ''اقتصادی'' ترقی ہے اور یہ معلوم ہے کہ حکومت کے خزانے ٹیکسوں سے بھرے جاتے ہیں۔ دوسری قسم کی حکومت وہ ہے جس کا مقصد خلق کو خدا کی بتائی ہوئی راہ پر چلانا۔

جس حکومت کا جو مقصد ہوگا، وہ اسی مقصد کی طرف گامزن ہوگی، مگر جو مقصد ہوگا اس کے مطابق نتائج بھی سامنے آئیں گے۔

جس حکومت کا مطمع نظر تحصیل دولت ہوتا ہے، یعنی رعایا سے ٹیکس وصول کر کے خزانے بھرنا، اس کا سارا نظام بس اسی فکر کے ماتحت گردش کرتا ہے کہ اس کی اقتصادی حالت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو، آمدنی بے حساب ہو، اہل حکومت کو عیش و آرام کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آئیں، ملک کی معیاری تہذیب تکلفات کا مرقع ہو اور شہریت اور اس کے مظاہر میں اس کے اندر کشش اور اس معیار کی دل کشی ہو کہ دیکھنے والے کو جنت ارضی کا گمان ہو۔ چاہے ان اغراض کے لیے اسے غریبوں کا خون چوسنا پڑے، مزدوروں اور کسانوں پر ستم توڑنے پڑیں، بھاری ٹیکس اور محصولات عائد کرنے پڑیں، اسے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ غریب رعایا پر کیا گزرے گی۔ نت نئے ٹیکسوں کے نیچے دب کر اس کی کیا گت بنے گی، یا جس شہریت کے ایک رخ کو اتنا خوش منظر بناتا چاہتی ہے اس کا دوسرا رخ کتنا بھیانک ہو جائے گا۔ اس کی تمام تر دلچسپیاں صرف ان کاموں اور ان چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں، جن سے اس کی آمدنی اور آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہو، جن سے اس کی شان و شوکت بڑھتی ہو، جو بادشاہ یا رئیس مملکت اور اس کے وزراء کے لیے ان کی آل و اولاد کے لیے ان کے خاندان اور اہل خاندان کے لیے، ان کے دوستوں اور دوستوں کے عزیزوں کے لیے، ان کے خدمت گزاروں، حاشیہ نشینوں اور جی حضوریوں کے لیے عیش و عشرت کا سامان مہیا کریں اور جن چیزوں کی بدولت وہ شاندار محل اور عالیشان کوٹھیاں تعمیر کرا سکیں اور بڑی بڑی جائدادوں، کارخانوں اور فیکٹریوں کے مالک بن سکیں، اس قسم کی حکومت کو اس کے علاوہ اور کسی چیز

سے دلچسپی نہیں ہوتی.

ایسی حکومت کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ جمہور کی اخلاقی اور روحانی تربیت سے غفلت برتتی ہے، ان کے اخلاق اور جذبات کی نگرانی کی قطعاً فکر نہیں کرتی، کیونکہ اس کے نزدیک کسی چیز کے قابل توجہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس میں کوئی مالی یا سیاسی فائدہ نظر آئے۔ اسی لیے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی معیوب یا ممنوع کام کے ارتکاب میں حکومت کو کوئی اس قسم کا فائدہ نظر آتا ہے تو وہ اس کام کو قانوناً جائز قرار دے دیتی ہے، بلکہ اس میں لوگوں کی بہت افزائی کرتی ہے اور اس کے برعکس اگر کسی جائز کام میں کسی مالی یا سیاسی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے تو اس کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کی مالی حرص بلکہ بھوک اس حد تک پہنچی ہوئی ہوتی ہے کہ ہر وہ کام اور ہر وہ اقدام جو آمدنی بڑھانے کا ذریعہ بن سکتا ہو، فی نفسہ خواہ کتنا ہی معیوب کیوں نہ ہو، اس کی نگاہ میں مستحق ہو جاتا ہے، حتی کہ بعض اوقات عبادات اور مرنے جینے تک پر (کسی بہانہ سے) ٹیکس لگا دیا جاتا ہے اور اس طرح یہ حکومت اپنے اصل فرائض (یعنی عوام کے مفاد کی نگرانی، ان کی راحت اور خوشحالی کی فکر اور ان کی اصلاح و تربیت کے انتظام) کو پس پشت ڈال کر ایک بڑی تجارتی کمپنی کا پارٹ ادا کرنے لگتی ہے جسے نفع اندوزی کے سوا نہ کوئی فکر ہے نہ کوئی کام.

اس کے برعکس دوسری قسم کی حکومت یعنی جو حکومت، برائے ہدایت کے نظریہ پر قائم ہوتی ہے، اس کے سامنے ایسے پست اور ذلیل مقاصد نہیں ہوتے وہ مالی منفعت اور سیاسی قوت کی بندگی نہیں کرتی، بلکہ اس کا ایک بالکل بے غرض اور بے لوث مشن ہوتا ہے جس کی خدمت کو وہ اپنے اقتدار کا سب سے اہم اور اول مصرف سمجھتی ہے۔ وہ مشن کیا ہوتا ہے؟ لوگوں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانا، انہیں بھلائی اور سچائی کی راہ پر لگانا اور برائی کی راہ سے ہٹانا۔ وہ اپنی کامیابی کا معیار زیادہ آمدنی اور زیادہ بچت کو نہیں قرار دیتی، بلکہ اس کے نزدیک کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اس کی قلمرو میں عام طور سے لوگوں کا کریکٹر بلند ہو۔ ان کے دل اور ان کی روحیں پاکیزہ ہوں، ان کی سیرتیں پسندیدہ اوصاف اور اچھی عادات کا آئینہ ہوں۔ مرنے کے بعد والی زندگی ان کی توجہات کا مرکز ہو، اس دنیا کے لیے زائد منافع میں ان کا انہماک کم سے کم ہو۔ معیشت میں قناعت کے اصول پر عمل پیرا ہوں۔ معمولی گزر بسر کے لیے جتنا کافی ہو اس سے زیادہ کی ہوس نہ رکھتے ہوں۔ بری باتوں سے نفرت

رکھتے ہوں۔ خالق کی نافرمانی کے قریب جانے سے ڈرتے ہوں اور اچھی باتوں اور بھلے کاموں میں ہر شخص دوسروں سے بڑھ جانے کی حرص رکھتا ہو۔ یہ ہے اس حکومت کی کامیابی کا معیار۔ اگر یہ باتیں اس کے جمہور میں پائی جاتی ہیں تو وہ اپنے آپ کو انتہائی کامیاب اور خوش نصیب سمجھتی ہے، اگر چہ اس کامیابی کی قیمت اسے اپنے پورے خزانہ سے ادا کرنی پڑے اور بچت کے نام کی ایک کوڑی بھی نہ رہے۔

اپنے پرخلوص مشن کی تکمیل کے لیے یہ حکومت طرح طرح کی کوششیں کرتی ہے، ملک کے ہر حصے میں واعظوں کا تقرر کرتی ہے یا مبلغین بھیجتی ہے، امور خیر میں ہمت افزائی کرتی ہے، شراب سازی اور شراب نوشی بند کرتی ہے۔ ہر برے اور نازیبا کام پر داد و گیر کرتی ہے، ناچ رنگ کی محفلیں سرد کرتی ہے، اخلاق و جذبات کو بگاڑنے والے کھیل تماشوں کو ممنوع قرار دیتی ہے، عریانی اور فحاشی پھیلانے والے عناصر کو معاشرہ میں سے نکال کر پھینک دیتی ہے۔ غرض وہ نظام عقائد، نظام اخلاق اور نظام معاشرت میں بگاڑ پیدا کرنے والے تمام عوامل اور محرکات کا انسداد کرتی ہے اور اس کو وہ اپنا اہم فرض سمجھتی ہے۔ اس حکومت کے دور میں مسجدیں آباد اور میکدے ویران نظر آتے ہیں۔ اچھے عناصر طاقت پا کر ابھرتے ہیں اور ملک پر اپنی اچھائیوں کے ساتھ چھا جاتے ہیں۔ اس کے برعکس برے عناصر دبنے اور روپوش ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف نیک کرداری اور نیک عملی کا دور دورہ ہوتا ہے اور:

الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور (الحج:۴۱)	وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، معروف کا حکم کریں اور منکر سے منع کریں اور بے شک اللہ ہی کے قبضہ میں ہے انجام کار۔

کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اس حکومت کی پوری مشینری میں اور اول الذکر قسم کی حکومت کی مشینری میں ہر لحاظ سے بڑا اختلاف ہوتا ہے۔ یہ اپنے طبعی میلانات اور جذبات میں اپنے کردار اور معاملات میں اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کے کاموں میں حُب خیر اور احتساب کی شان، ایثار و خدمت اور دیانت

داری کی اسپرٹ اور قربانی ووفا شعاری کے جذبات نظر آتے ہیں، اس کا ہر قدم اسی اسپرٹ اور انہیں جذبات کے ماتحت اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس دوسری قسم کی حکومت (جس کا اصل مقصد تحصیل دولت ہوتا ہے) کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی مشینری میں خدمت، ایثار اور دیانتداری کی روح بالکل مفقود ہوتی ہے، اس لئے مملکت کے قانون اور اس کی مشینری کے درمیان سخت کشاکش دیکھنے میں آتی ہے۔ خود حکومت کی مشینری ہی حکومت کے قانون کو ناکام اور بے بس کرنے اور اس سے گلو خلاصی کے درپئے رہتی ہے۔ وہ عوام کے مقابلے میں خود کو برتر سمجھتی ہے، اسے اپنی حیثیت پر غرور اور گھمنڈ ہوتا ہے، اس کے کل پرزے جھوٹ، بددیانتی، منافقت اور رشوت ستانی کے اس درجہ خوگر ہوتے ہیں کہ بعض وقت ایک شریف انسان خانہ کعبہ تک یہ دعا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ خدایا! ان سے کبھی واسطہ نہ ڈالئے! ان لوگوں کی یہ خصلتیں یہ حال کر دیتی ہیں کہ جب تک آدمی ادھر اُدھر تھوڑا بہت خرچ نہ کر دے اپنے ان حقوق کا فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا جو بحیثیت مملکت کے شہری ہونے کے مملکت کا قانون اس کے لئے تسلیم کرتا ہے۔ حتیٰ کہ انصاف جیسے بنیادی حق کے حاصل کرنے کے لیے بھی اسے کچھ قیمت چکانی پڑتی ہے۔ غرض اس حکومت کے سایہ میں عام باشندوں کو بڑی سخت پریشانیوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے کہ ببول کے سایہ میں کانٹوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اس حکومت کی مشینری کا کوئی فرد یہ عقیدہ تو رکھتا نہیں کہ مجھے جو کچھ اختیار اور قوت حاصل ہے وہ قوم اور اہل ملک کی امانت ہے۔ جس کا مجھے غلط استعمال نہیں کرنا چاہیے اور میں صرف ایک خادم ہوں، بلکہ وہ تو اپنے بارے میں خیال رکھتا ہے کہ میں ایک محصّل ہوں اور مجھے جو کچھ اختیار حاصل ہے اس کا صحیح مصرف تحصیل وصول ہے اور وہ بھی جہاں تک ہو سکے اپنے لیے نہ کہ سرکاری خزانے کے لیے حکومت نے مجھے اس عہدے یا پوسٹ پر پہنچا کر کمائی کا ایک بہترین موقع دیا ہے۔ میں اسے کیوں ہاتھ سے جانے دوں، یہ تو بہتی گنگا ہے جس میں ہر شخص ہاتھ دھو رہا ہے، میں ہی کیوں محروم رہوں اور جب لٹیروں کے قافلے میں شرکت ہی کی ہے تو ان کے امتیازی پیسے سے پرہیز کیوں کر کروں؟

تاریخ میں اس ننگِ انسانیت حکومت کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں اور آج بھی ہم اپنے چاروں طرف اسی قسم کی حکومتیں پاتے ہیں۔ اس لیے نہ تو اس کی تمثیل کی چنداں ضرورت ہے اور نہ اس کی خصوصیات کی مزید وضاحت کی، البتہ وہ حکومت جس کے پیش نظر بندگان خدا کی ہدایت اور بھلائی ہوتی ہے اس کی مثالیں تاریخ میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں اور فی زمانہ تو وہ بالکل عنقا ہے، اس

لیے اس کی وضاحت کے لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی حکومت کی کوئی مثال بیان کی جائے۔

چھٹی صدی عیسوی میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو مخالفین کا وہ بہترین عنصر اس دعوت حق کی طرف کھینچ آیا جس نے اپنے زمانے اپنے قرآن کی ان آیات کا بہترین مصداق ثابت کیا۔

نحن نقص علیک نباهم بالحق، انهم فتیةٌ آمنوا بربهم وزدناهم هدی وربطنا علی قلوبهم اذا قاموا فقالوا ربنا رب السّمٰوٰت والارض لن ندعو من دونه الها لقد قلنا اذا شططاً o هولاء قومنا اتخذوا من دونه آلهة لولایأتون علیهم بسلطان بین فمن اظلم ممن افتریٰ علی الله کذبا (الکہف:۱۳۔۱۵)

ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں، وہ لوگ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کردی تھی، اور ہم نے ان کے دل مضبوط کردیئے، جبکہ وہ (دین میں) پختہ ہوکر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے، کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی ہی بے جا بات کہی، جو ہماری قوم ہے انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود قرار دے رکھے ہیں۔ یہ لوگ ان معبودوں پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے تو اس شخص سے زیادہ کون غضب ڈھالنے والا ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگادے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعوت پر لبیک کہنا سوسائٹی کی نظر میں ان کا بہت بڑا جرم تھا جس کی پاداش میں یہ مردان باصفا، جور و جفا اور قہر و بلا، کے تیروں پر رکھ لیے گئے۔ خوب خوب مشق ستم کی گئی اور پوری سنگدلی کے ساتھ ستائے گئے، مگر ان سے تو پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا۔

احسب الناس اَن یترکوا اَن یقولوا آمنا وهم لایفتنون ولقد فتنا الذین من قبلهم فلیعلمنّ الله الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین (العنکبوت:۲۔۳)

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں صرف "امنا" کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کے اس دعوے کی آزمائش نہیں کی جائے گی، حالانکہ ہم نے ان کے اگلوں کو آزمایا ہے اللہ تعالیٰ ضرور جان لے گا ان کو جو سچے ہیں اور ان کو جو جھوٹے ہیں۔

اس لیے آزمائش کے اس مرحلے میں ان کے قدم ذرا نہ ڈگمگائے اور پہاڑوں کی سی شان استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ مصائب تو وہی ہیں جن کے آنے کی خبر اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے ہمیں پہلے ہی دے دی تھی۔ **هذا ما وعدنا الله و رسوله وصدق الله و رسوله**۔ وہ آزمائش و ابتلاء کے ان کٹھن مراحل کو پورے صبر و ثبات کے ساتھ طے کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کی کھری انسانیت اور سچائی ظاہر ہوگئی، اور اللہ نے ہجرت کی اجازت مرحمت فرمادی، اب ان کی دعوت کو نسبتاً کم دشوار گزار راستہ مل گیا، پہلی سی مزاحمتوں کا سامنا نہ رہا، اس لئے کامیابی کی رفتار تیز ہوگئی اور رفتہ رفتہ یہ جماعت اس پوزیشن میں آگئی کہ خلافت ارضی کی ذمہ داریاں سنبھال سکے، پس مشیت الٰہی کا تقاضہ ہوا کہ انہیں اقتدار حکومت بخش دیا جائے، تاکہ یہ دنیا میں اعتدال قائم کریں ظلم اور بے انصافی کا استیصال کریں، انسانوں کو ظنون و اوہام کی اندھیروں سے نکال کر نور حقیقت سے آشنا کریں۔ جن غلط اصولوں کی پابندی اور رسوم و رواج کی بندشوں نے ان پر زندگی تنگ کر رکھی ہے ان سے نجات دلا کر ان پر جینا آسان کریں اور ان کو انہیں جیسے انسانوں کو غلامی سے آزاد کرا کر صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی غلامی اور بندگی کا سبق پڑھائیں۔ یہ ذمہ داریاں تھیں جو حکومت کے ساتھ ان پر عائد کی گئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے ان ذمہ داریوں کا حق ادا کر دکھایا اور وہی کام کیے جو حکومت برائے ہدایت کا طرہ امتیاز ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کیا۔ ہر برائی کی بندش کی اور ہر بھلائی کی پرورش۔

بہرحال دعوت اسلامی کا یہ شجر حکومت کا پھل لایا اور جن لوگوں نے اس پودے کے نشو و نما اور اس کی حفاظت و بقا کی خاطر اپنی جانوں کی بازیاں کھیلی تھیں انہوں نے اپنی قربانیوں کا پہلا صلہ عزت و شوکت اور اقتدار کی صورت میں پالیا۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہ انعام بجائے خود ایک بڑا امتحان تھا، بلکہ اب تک کے تمام امتحانوں اور تمام آزمائشوں سے زیادہ سخت اور نازک امتحان تھا۔ مشیت کے اس تازہ فیصلہ نے انہیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ حکومت کے دوراہے پر جہاں ان کے سامنے دو راستے تھے، ایک راستہ حکومت برائے خدمت و ہدایت کا تھا اور دوسرا راستہ حکومت برائے دولت و راحت کا تھا، اس منزل تک یہ قافلہ بغیر حکومت کے ہدایت و خدمت ہی کی راہ پر گامزن تھا، مگر یہاں پہنچ کر ایک دوسری راہ

بھی سامنے آگئی تھی جس کا ہر ذرہ مجسم کشش تھا، اس میں قدم قدم پر مال و دولت کے انبار تھے۔ سیم و زر کی چمک دمک تھی، عیش وعشرت کے مواقع تھے اور سب سے بڑھ کر حکومت کے نام سے خدائی تھی۔ بس شرط اتنی تھی کہ یہ اس راستے پر قدم بڑھا دیں اور اس راہ کے پیشروؤں کی طرح رعایا کو ٹیکس، محاصل اور رشوت وخراج کے بھاری بوجھوں تلے دبا دیں......ان دونوں میں سے کسی ایک راہ کا انتخاب کرنا تھا۔ اس لیے یہ قافلہ ذرا ٹھٹکا، مگر فوراً ہی ہاتف غیبی نے پکار کر کہا:

''خبر دار! تم جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہو، جو دنیا کو سیدھی راہ پر لگانے آئے تھے، ٹیکس وصول کرنے نہیں آئے تھے۔ وہ صرف ہادی تھے نہ کہ جابی (محصل)۔

انہیں ذرا بھی تردد نہ ہوا، اور ایک لمحہ کی پس و پیش کے بغیر ''حکومت برائے ہدایت'' کی راہ اختیار کر لی اور فیصلہ کر لیا گیا کہ اللہ کے بخشے ہوئے اس اقتدار کو شخصی اور ذاتی منفعت و جاہ طلبی کے بجائے عام انسان کی ہدایت اور ہر پہلو سے اس کی زندگی کی اصلاح وتربیت کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اور یہی کام ہماری اس نوزائیدہ مملکت کا امتیازی نشان ہوگا۔ اس طرح وہ اس سخت ترین آزمائش میں بھی پورے اترے.

رضی الله عنهم وأرضا هم.